رسائل و مسائل

مفتوح فاتح کی عدالت میں

سوال: آج کل جنگی مجرموں (War Criminals) کو کیفر کردار تک پہنچانے کا بہت چرچا ہے۔ اسلام کا اس ضمن میں کیا حکم ہے؟

جواب: یہ "جنگی مجرم" کی اصطلاح بھی ایک عجیب اصطلاح ہے جسے یورپ کے مکارانہ اخلاق نے موجودہ زمانہ میں ایجاد کیا ہے۔ اس کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک قوم جس سے کسی دوسری قوم کی لڑائی محض قومی اغراض کے لیے ہوئی تھی، جنگ میں فتح یاب ہونے کے بعد مفتوح قوم کے جنگی و سیاسی لیڈروں سے انتقام لینا چاہتی ہے۔ لڑائی دونوں طرف سے اقتدار اور منفعت طلبی کی خاطر ہوئی تھی۔ ایک دنیا پر پہلے مسلط ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے تسلط کو اور ان فائدوں کو جو اس جابرانہ و ظالمانہ تسلط کی بدولت اسے حاصل ہو رہے تھے، محفوظ رکھے، اور دوسرا بعد میں آیا اور اس نے پہلے کے تسلط و اقتدار کو اپنی راہ میں رکاوٹ دیکھ کر اسے ہٹانا چاہا۔ اس لحاظ سے دونوں کی لڑائی کسی پاکیزہ اخلاقی غرض پر مبنی نہ تھی۔ لیکن اب جبکہ ایک فریق غالب آگیا تو وہ اپنے اس غصہ اور اس انتقامی جذبہ کو جو اس کے دل میں محض اس لیے بھڑکا تھا کہ مخالف فریق نے اس کے اقتدار کو چیلنج کیوں کیا، اخلاق کا رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہم تو نہیں مگر ہمارا فریق مخالف ایک ڈاکو اور بدمعاش تھا اور اس نے دنیا کے امن کو غارت کیا (گویا کہ خود انھوں نے دنیا کے امن کو کبھی غارت نہیں کیا تھا) اس نے بستیوں پر ظلم ڈھائے (گویا کہ ظلم و ستم ڈھانے کا ارتکاب ان سے خود کبھی نہ ہوا تھا) اور اس نے عہد و پیمان توڑے (گویا کہ یہ ہمیشہ عہد و پیمان کے بڑے پابند تھے)۔۔۔ اس لیے اس کے بڑے بڑے لیڈر اور فوجی کمانڈر مجرم ہیں اور انھیں اسیر جنگ کے بجائے اخلاقی مجرم کی حیثیت سے سزا دی جانی چاہیے حالانکہ فی الواقع جس قومی جذبہ میں یہ خود سرشار ہیں اور ان کے لیڈر جس جذبے کے تحت اپنی قومی سربلندی کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں، اسی جذبے سے ان کی مخالف قوم کے لیڈر بھی سرشار تھے اور اپنی قوم کے لیے سربلندی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اور کوشش کے طریقوں میں اخلاقی نقطۂ نظر سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہ تھا۔ اب اصل غرض تو صرف یہ ہے کہ حریف قوم کے اندر جن لوگوں نے قومی جذبہ کو بھڑکایا تھا، اور جو اس امر کی قابلیت رکھتے تھے کہ اپنی قوم کو منظم کرکے اور اس کے وسائل کو ترقی دے کر میدان مقابلہ میں استعمال کر سکیں، انھیں ختم کر دیا جائے تاکہ یہ قوم ہمارے اقتدار اور ہمارے تسلط علی الارض کو چیلنج کرنے کے قابل نہ ہو سکے، لیکن اس خالص انتقامی جذبہ کی گھناؤنی صورت کو اخلاقی عدل کی خوشنما نقاب سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ اخلاقی عدل کا ڈھونگ جس طرح ایک فریق کامیاب ہو جانے کے بعد رچا سکتا ہے، بعینہٖ اسی طرح دوسرا فریق بھی فتح یاب ہونے کے بعد رچا سکتا تھا، اور اس صورت میں بھی اخلاقی حیثیت سے یہ ایک نہایت ذلیل قسم کا مکر و فریب ہی ہوتا۔ میں حیران ہوں کہ موجودہ تہذیب نے دنیا کی بڑی بڑی متمدن اور ذی عزت قوموں اور ان کے مدبرینِ سلطنت کے اندر کس قسم کی بے حیائی پیدا کر دی ہے اور ان قوموں کے علماء و فضلا اور فلاسفہ

اخلاقی کی اخلاقی حس کو کیسا کند کر دیا ہے کہ ایسی ایسی صریح مکارانہ باتیں علی الاعلان کی جاتی ہیں اور کسی کو ان کے اندر نہ شرم محسوس ہوتی ہے اور نہ کوئی ان کے گھناؤنے پن کو محسوس کرتا ہے۔ کون صاحب عقل و تمیز آدمی، جو عدل کے معنی کا ذرہ برابر شعور رکھتا ہو، یہ تصور کر سکتا ہے کہ جنگ کا ایک فریق عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر دوسرے فریق کے ساتھ واقعی انصاف کر سکے گا؟ — اگر انفرادی زندگی میں کسی مقدمہ کا ایک فریق دوسرے فریق کے لیے جج نہیں بن سکتا تو قومی زندگی میں آخر ایک فریق جنگ دوسرے فریق جنگ کے لیے جج کیسے بن سکتا ہے؟

آپ پوچھتے ہیں کہ اسلام کا اس معاملہ میں کیا حکم ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اسلام اس قسم کے کرکو مکر ہی سمجھتا ہے۔ اس کے نقطۂ نظر سے تمام وہ لوگ جو فریقین جنگ میں سے ایک دوسرے کے ہاتھ آئیں، اسیر جنگ ہیں اور اسیران جنگ کے متعلق اسلام کے احکام جو کچھ ہیں وہ واضح طور پر میں اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں بیان کر چکا ہوں۔ لڑائی کے بعد عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر مجرم کی حیثیت سے دشمن کو بلانا اور اس کا فیصلہ کرنے کے لیے خود بیٹھ جانا بہت بڑے پیمانہ کی اخلاقی بے حیائی چاہتا ہے اور اسلام وہ دین ہے جو حیا کو محض شعبۂ اخلاق ہی نہیں، بلکہ شعبۂ ایمان قرار دیتا ہے۔

میدان جنگ میں قحبہ گری کے انتظامات اور اسلام

سوال: آج کل جنگ میں جہاں سپاہیوں کو وطن سے ہزاروں میل دور جانا پڑتا ہے اور ان کی واپسی کم از کم دو سال سے پہلے ناممکن ہو جاتی ہے، سوشل قباحتیں مثلاً زنا وغیرہ کا پھیل جانا لازمی ہے کیونکہ جنگ کے جذبہ کی بیداری کے ساتھ تمام جذبات سفلی بھی بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے یا قابو میں لانے کے لیے فوجیوں کے لیے رجسٹرڈ رنڈیاں بہم پہنچانے کی اسکیم پر عمل ہو رہا ہے اور ان کے دلوں کو خوش رکھنے کے لیے (W.A.C.I) دفتروں میں ملازم رکھی جا رہی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں قابل نفرین ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تردید کے بعد اسلام اس عقدہ کے حل کا کیا طریق بتاتا ہے۔ کنیزوں کا سسٹم کس حد تک اس قباحت کا ازالہ کر سکتا ہے اور کیا وہ بھی ایک طرح کی جائز کردہ قحبہ گری (Prostitution) نہیں ہے؟

جواب: آپ کے دوسرے سوال میں ایک پیچیدگی ہے جسے شائد آپ نے اپنا سوال تحریر کرتے وقت محسوس نہیں کیا۔ آپ جس مسئلہ کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں اس میں آپ کے پیش نظر تو ہیں موجودہ زمانہ کی فوجیں اور ان کی ضروریات، لیکن اس کا حل چاہتے ہیں آپ اسلام سے۔ حالانکہ اسلام جن فوجوں کی ضروریات کا ذمہ لیتا ہے وہ اس کی اپنی فوجیں ہیں نہ کہ فساق و فجار اور جبابرہ کی فوجیں۔

موجودہ زمانہ کی فوجوں کا حال یہ ہے کہ انھیں محض لڑنے کے لیے تیار کیا جاتا ہے اور جو سلطنتیں ان کو تیار کرتی ہیں، خود ان کے پیش نظر بھی کوئی پاکیزہ اخلاقی نصب العین نہیں ہوتا۔ اگر وہ اپنی قومی فوج تیار کرتی ہیں تو ان کے اندر صرف وہ اخلاقیات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو قوم کا جھنڈا بلند کرنے اور بلند رکھنے کے لیے درکار ہیں، اور ظاہر ہے کہ ان اخلاقیات میں طہارت اخلاق کے عنصر کا کوئی مقام نہیں ہے — اور اگر وہ اپنی محکوم قوموں میں سے اپنی اغراض کے لیے فوجیں تیار کرتی ہیں تو انھیں صرف اس اخلاق کی تربیت دیتی ہیں جو پالتو شکاری کتوں میں پیدا کیا جاتا ہے (یعنی یہ کہ روٹی دینے والے کے وفادار رہیں اور شکار اس کے لیے ماریں

نہ کہ اپنے لیے) اس کے سوا کسی دوسرے اخلاق کی اہمیت سرے سے ان "مہذب" قوموں میں ہے ہی نہیں اور زنا، شراب، جوا اور دوسری قسم کی بداخلاقیاں تو نیچے سے لے کر اونچے طبقوں تک خود ان کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ نیز جبکہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر ہی یہ ہے کہ "بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فوجوں میں کسی قسم کا اخلاقی انضباط پایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی فوجیں مار دھاڑ کے فنون میں تو انتہائی کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن طہارت اخلاق کے نقطۂ نظر سے پستی کی اس حد تک گری ہوئی ہوتی ہیں جس کا مشکل ہی سے کوئی انسان تصور کر سکتا ہے۔ انھیں کھانے کے لیے دل کھول کر راشن دیا جاتا ہے، پینے کے لیے خم شراب کا منہ ہر وقت کھلا رکھا جاتا ہے، خرچ کرنے کے لیے پیسے بھی کافی دے دیے جاتے ہیں، پھر سانڈوں کی طرح انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اپنی خواہشات نفس جہاں اور جس طرح چاہیں پوری کرتے پھریں۔ حکومتیں خود بھی ان کے لیے قحبہ خانے تیار رکھتی ہیں، قوم کی لڑکیوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے لڑنے والے سپاہیوں کی خاطر اپنے جسم رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کو قومی ایثار اور سرمایۂ افتخار سمجھیں اور اس پر بھی جب ان انسانی نروں کے بھڑکے ہوئے جذبات ٹھنڈے نہیں ہو سکتے تو ان کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ انسانی گلہ میں جہاں بھی ادائیں ان کو نظر آئیں، ان سے "بزور" یا "بزر" ان کے جسم خرید لیں یا چھین لیں۔ اس طرح جن فوجوں کو پالا گیا ہو، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب وہ دشمنوں کے ممالک میں فاتحانہ داخل ہوتی ہوں گی تو وہاں ان کی شہوانی ضروریات کتنی بڑھ جاتی ہوں گی اور کس قیامت خیز صورت میں وہ پوری کی جاتی ہوں گی!

اب آپ خود ہی سوچ لیں کہ ایسی فوجوں کے مسائل اور ان کی ضروریات کا حل اسلام کیسے بتا سکتا ہے۔ انھیں مغرب ہی کے مادہ پرستانہ اخلاق نے پیدا کیا ہے اور ان کے شرمناک مسائل کا حل بھی وہی پیش کر سکتا ہے۔ اسلام جن فوجوں کو تیار کرتا ہے وہ سیاسی و معاشی جغرافیہ کے اوراق بھاڑنے اور جوڑنے کے لیے تیار نہیں کی جاتیں، بلکہ صرف اس لیے تیار کی جاتی ہیں کہ دنیا اگر خدا کی اطاعت سے پھری ہوئی ہو اور دعوت و تبلیغ سے راہ راست پر نہ آئے تو اسے بزور شمشیر اتباع زور کر دیا جائے کہ وہ کم از کم فتنہ و فساد سے تو باز آجائے۔ اس متعین مقصود کے لیے جو فوجیں جہاد کرتی ہیں، ان کا جہاد فی سبیل النفس نہیں بلکہ فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور وہ میدان جنگ میں بھی اسی جذبہ عبادت کے ساتھ جاتی ہیں جس کے ساتھ وہ صحن مسجد میں قدم رکھتی ہیں۔ پھر اس میدان میں ان کو اتارنے سے پہلے تزکیۂ نفس اور تطہیر اخلاق کے ایک پورے کورس سے انھیں گذارا جاتا ہے۔ انھیں خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی سرکوبی کا کام سکھانے کے ساتھ یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے نفس کو، اگر خدا سے پھرا ہوا ہو، کس طرح زیر کریں اور دوسروں کو احکام الٰہی کا مطیع بنانے سے پہلے خود اپنے آپ کو کس طرح مطیع بنائیں۔ انھیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ میدان جنگ میں قدم قدم پر خدا کو یاد کرتے ہوئے بڑھیں، عین لڑائی کی حالت تک میں نماز اپنے وقت پر ادا کریں اور دن ان کے گھوڑے یا ٹینک کی پشت پر گذریں تو راتیں مصلے پر۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی تربیت یافتہ فوج جو ایک پاکیزہ اخلاقی مقصد کے لیے لڑے اور اپنے عقیدہ کے مطابق زمانہ جنگ کو زمانۂ عبادت سمجھتی ہوئی رقبۂ جنگ میں رہے، اس کی شہوانی ضروریات بھی موجودہ فوجوں کی ضروریات جیسی نہیں ہو سکتیں اور نہ وہ اپنی ان ضروریات کو پورا کرنے میں ان فوجوں کی طرح آزادی کی خواہشمند ہو سکتی ہے۔

اگرچہ بعض روایات کے مطابق زمانۂ جنگ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کو جائز رکھا تھا (جسے عرب میں پہلے جائز سمجھا جاتا تھا) لیکن یہ بات ثابت ہے کہ بہت جلدی آپ نے اس کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس میں شک نہیں کہ زمانۂ جنگ میں پکڑی ہوئی کنیزوں کو

استعمال کرنے کی اجازت اسلام میں دی گئی ہے، لیکن وہ بھی صرف اس صورت میں ہے جبکہ امام وقت اس کو سپاہیوں میں تقسیم کرکے انھیں سپاہیوں کی ملک قرار دے دے، تاکہ ایک سپاہی کا تعلق جس کنیز یا جن کنیزوں سے ہو، انھیں تک اس کا تعلق شہوانی محدود رہے اور دوسرے کسی شخص کے لیے ان کے ساتھ یہ تعلق جائز نہ ہو۔ نیز حکومت کے توسط سے قانونی طور پر یہ تعلق قائم ہونے کے بعد سوسائٹی میں یہ بات معلوم و معروف رہے کہ یہ خاص عورت فلاں خاص مرد کی ہے (یعنی وہی فائدہ جو نکاح کا ہے) اس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام حالت جنگ میں اپنی فوجوں کی شہوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اخلاقی قیود میں ذرہ برابر بھی کوئی ڈھیل پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ چاہتا ہے کہ جائز تعلق شہوانی کے مواقع میسر آنے تک وہ ضبط نفس سے کام لیں، خواہ یہ موقع میسر آنے میں کتنے برس لگ جائیں۔ البتہ حدیث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے حکومت کا فرض یہ دیکھنا بھی ہے کہ اس کے سپاہی زیادہ مدت تک اپنی عورتوں سے علیحدہ رہنے اور اسی طرح ان کی عورتیں اپنے مردوں سے جدا رہنے کی بنا پر کسی بد اخلاقی میں مبتلا نہ ہونے پائیں۔ یہی غرض تھی جس کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:-

حرمت نساء المجاھدین علی القاعدین کحرمت امہاتھم	مجاہدین کی بیویاں پیچھے رہنے والے مردوں کے لیے اپنی ماؤں کی طرح حرام ہیں۔

اور یہ کہ:-

ما من رجل من القاعدین یخلف رجلاً من المجاھدین فی اھلہ فیخونہ فیھم الا وقف لہ یوم القیامۃ فیاخذ من عملہ ما شاء ـــ فما ظنکم؟	جو شخص پیچھے رہنے والوں میں سے کسی مجاہد کی بیوی کے معاملہ میں خیانت کا ارتکاب کرے گا وہ قیامت کے روز اس مجاہد کے سامنے پیش کر دیا جائے گا کہ اس خائن کے اعمال خیر میں سے جو کچھ چاہے لے لے۔ پھر تم کیا گمان کرتے ہو کہ وہ اس کے

اور یہی غرض تھی جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے ایک مجاہد کی بیوی کو اس کے فراق میں عشقانہ اشعار گاتے ہوئے سن کر یہ حکم دیا تھا کہ سپاہیوں کو اتنی زیادہ طویل مدت تک ان کی بیویوں سے جدا نہ رکھا جائے جس میں ان کے بد اخلاقی سے ملوث ہو جانے کا احتمال ہو۔ بالفاظ دیگر فوج میں رخصت (   ) کا سسٹم اسلامی حکومت میں زیادہ تر اسی غرض کے لیے جاری کیا گیا تھا۔

آپ کا یہ سوال کہ کنیزوں کے استعمال کی اجازت کیا قحبہ گری (   ) کو قانونی جواز دینے کی ہم معنی نہ تھی، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ یا تو قحبہ گری کے معنی سے ذہول برت رہے ہیں، یا کنیزوں سے تمتع کی صحیح حیثیت آپ کے سامنے نہیں ہے۔ قحبہ گری در اصل اس چیز کو کہتے ہیں کہ ایک مرد کسی عورت کا جسم کرایہ پر مستعار حاصل کرے۔ اور شوقیہ قحبہ گری یہ ہے کہ کسی متعین کرایہ کے بغیر (چاہے ہدیوں اور تحفوں کی مقدار مارکیٹ ریٹ سے بہت زیادہ ہی کیوں نہ ہو) یہ مستعار تعلق قائم ہو۔ لیکن کنیز کے ساتھ تمتع سرے سے مستعار ہوتا ہی نہیں، بلکہ جب تک وہ کنیز اس شخص کی ملکیت میں ہے، وہ ویسا ہی ایک مستقل تعلق ہے جیسا زوجین میں ہوا کرتا ہے اور اسی کی رو سے قانون اولاد کا نسب اسی طرح ثابت ہوتا ہے جس طرح نکاح سے ثابت ہوتا ہے۔

المہدی کی علامات اور نظام دین میں اسکی حیثیت

سوال:- ظہور مہدی کے متعلق آپ نے رسالہ تجدید و احیائے دین میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اختلاف کا ایک پہلو یہ ہے کہ

کہ آپ مہدی موعود کے لیے کوئی امتیازی و اختصاصی علامات تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ احادیث میں واضح طور پر علامات مہدی کا تذکرہ موجود ہے۔ آخر اس سلسلۂ روایات سے چشم پوشی کیسے کی جا سکتی ہے؟

جواب: ظہور مہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اسقدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام مہدی کا ظہور ہوگا۔ اسماء الرجال کی تنقید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان احادیث کے اکثر رواۃ شیعہ ہیں تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر گروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے اور اپنے کسی آدمی پر ان کی مندرجہ علامات کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان وجوہ سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہور مہدی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیلی علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے اور اہل غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کو اصل ارشاد نبوی پر اضافہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے مہدی موعود ہونے کے جھوٹے دعوے کیے ہیں، ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری فتنہ پردازی کے لیے مواد انھیں روایات نے بہم پہنچایا ہے۔

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں پر غور کیا ہے، ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اس طریقے سے کبھی آپ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہور مہدی کی احادیث میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اصولی علامات تو ضرور بیان فرمادیا کرتے تھے، لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپ کا طریقہ نہ تھا۔

سوال: ضرورت بعثت مہدی کو "تجدید و احیائے دین" میں تسلیم تو کر لیا گیا ہے، لیکن مہدی کا کیا کام ہوگا، اس مسئلہ کو نقلی تائید کے بغیر محض اپنے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ احادیث شریفہ کی روشنی میں اس کی تفصیل کی جائے تو مناسب ہے۔ نیز مہدی موعود کے مراتب و خصوصیات اور ضرورت اطاعت مہدی وغیرہ پر کوئی بحث نہیں کی گئی ہے، بلکہ عام مجددین میں شمار کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ مجدد کامل اور مجدد ناقص کی تقسیم سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ غالباً یہاں "مجدد" کا لفظ بر بنائے لغت استعمال ہوا ہے، اصطلاحاً نہیں۔ تاہم جبکہ مجدد معصوم عن الخطا نہیں ہوتا اور مہدی موعود کو معصوم عن الخطا ہونا ضروری ہے تو پھر اس بین فرق کے ہوتے ہوئے مہدی موعود کو مجدد کی فہرست میں کیسے شمار کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اول تو خود لفظ "مہدی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضور نے مہدی کا لفظ استعمال فرمایا ہے، جس کے معنی ہیں ہدایت یافتہ کے، "ہادی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے: مہدی ہر وہ سردار، لیڈر، اور امیر ہو سکتا ہے جو راہ راست پر ہو، "المہدی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کی کسی خاص امتیازی شان کا اظہار مقصود ہے۔ اور وہ امتیازی شان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام درہم برہم ہو جانے اور ظلم و جور سے زمین کے بھر جانے کے بعد از سر نو خلافت کو منہاج نبوت پر قائم کرے گا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ پس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو مخصص و ممتاز کرنے کے لیے "مہدی" پر "ال" داخل کیا گیا ہے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مہدی کے نام سے دین میں کوئی خاص منصب قائم کیا گیا ہے، جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاء پر ایمان لانا، اور اس کی اطاعت بھی شرط نجات اور شرط اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ مہدی کوئی امام معصوم ہوگا۔ دراصل یہ معصومیت غیر انبیاء کا تخیل ایک خالص شیعی تخیل ہے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔

یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جن چیزوں پر اسلام و کفر کا مدار ہے اور جن پر انسان کی نجات موقوف ہے وہ سب قرآن میں موجود ہیں اور ان کا ثبوت قرآن ہی سے ملنا چاہیے۔ مجرد حدیث پر ایسی کسی چیز کی بنا نہیں رکھی جا سکتی جسے مدارِ کفر و ایمان قرار دیا جائے۔ احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی ہوئی آئی ہیں، جن سے حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہوتی ہے تو وہ محض گمانِ صحت ہے نہ کہ علم یقین۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس خطرہ میں ڈالنا کبھی پسند نہیں کر سکتا کہ جو امور دین میں اتنے اہم ہیں کہ ان سے کفر و ایمان کا فرق قائم ہوتا ہو، انھیں صرف چند آدمیوں کی روایت پر منحصر کر دیا جائے۔ ایسے امور کو تو اللہ نے خود اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے اور اللہ کے رسول نے انھیں اپنے مشن کا اصل کام قرار دیتے ہوئے ان کی تبلیغ عام کی ہے، حتیٰ کہ وہ بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے ہر ہر مسلمان تک پہنچائے گئے۔ پس مہدی کے متعلق خواہ کتنی ہی کھینچ تان کی جائے، بہرحال اس کی یہ حیثیت کبھی قرار نہیں دی جا سکتی کہ اس کے جانے اور اس پر ایمان لانے کے بغیر کوئی شخص مسلمان نہ ہو سکتا ہو، یا بالفاظ دیگر نجات ہی نہ پا سکتا ہو۔ یہ حیثیت اس کی اگر ہوتی تو قرآن میں پوری صراحت کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی دو چار آدمیوں تک نہیں بلکہ پوری امت تک اسے پہنچانے کی سعیِ بلیغ فرماتے اور اس کی خبر کو اپنے مشن کا ایک جز سمجھتے ہوئے اسے پھیلانے کی کوشش فرماتے۔ یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسی ایک اہم چیز کو اخبارِ احاد پر چھوڑا جا سکتا تھا اور وہ اخبارِ احاد بھی اس درجہ کی کہ امام مالک اور امام بخاری اور امام مسلم جیسے لوگ اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں سرے سے ان کو لینا بھی پسند نہ کریں۔

خدا کے حضور میں دعا کرتے ہوئے ہاتھ اٹھانا

سوال: ۔ میرے متعلق مقامی حلقوں میں چہ میگوئیاں بڑھ رہی ہیں۔ خصوصاً بعد نماز ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر بہت لے دے ہو رہی ہے۔ یہاں بہت زیادہ آبادی ایک ایسے خاص مسلک کے پیروؤں کی ہے جن کا امتیازی گروہی شعار ہی یہی ہے کہ دعا کرتے ہوئے ہاتھ بلند نہ کیے جائیں۔ یہ حضرات اپنے اعتراض کے ساتھ دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ "ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ" کے ارشاد کا تقاضا یہی ہے کہ دعا میں حد درجہ اخفا برتا جائے اور ہاتھ اٹھانے سے اظہار ہوتا ہے۔ بدیں وجہ دعا میں ہاتھ اٹھانا قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ نیز احادیث سے بھی یہ ثابت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا التزام کیا ہو۔ اب عوام کو دلائل سے تو کچھ مطلب ہوتا نہیں، وہ لکیر کی فقیری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مجھے صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ میں ان کی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس حکم کے نافذ کرنے والوں میں بعض حضرات خوب اچھے تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ خیر یہ تو جاہلیت کے کرشمے ہیں۔ مجھے صرف مذکورۃ الصدر آیت کی روشنی میں اصل مسئلہ کو سمجھنا ہے۔

جواب: ۔ ان حضرات سے یہ دریافت کیجیے کہ "ادعوا ربکم تضرعا وخفیۃ" کا اگر یہی تقاضا ہے جو آپ لوگ سمجھتے ہیں تو یہ نماز کے لیے بلند آواز سے اذان اور پھر علانیہ مسجد میں لوگوں کا جانا، جماعت سے نماز پڑھنا، جہری قرأت کرنا، یہ سب بھی تو آیت کے خلاف ہوں گے، کیونکہ نماز اصل میں تو ایک دعا ہی ہے اور دعا کے لیے اگر اخفا ایسا ہی لازمی ہے کہ اظہار کی کوئی شکل اس میں نہ ہو تو نماز باجماعت کی یہ پوری صورت اس آیت کے خلاف ہو جائے گی۔

علاوہ بریں احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ کی یہ ہدایت پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جب دعا مانگی جائے تو ہاتھ اٹھا کر مانگی جائے اور دعا سے فارغ ہو کر چہرے پر ہاتھ مل لیے جائیں۔ چنانچہ ابوداؤد، ترمذی اور بیہقی میں اس کے متعلق متعدد روایات موجود ہیں۔ ایک حدیث میں حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے کہ ان ربکم حیی کریم یستحیی من عبدہ اذا رفع یدیہ ان یردھما صفرا یعنی تمہارا رب ایسا باحیا اور کریم ہے کہ جب بندہ اس کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے تو اسے شرم آتی ہے کہ اپنے بندے کو خالی ہاتھ واپس کرے دوسری روایت میں حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود جب دعا مانگتے تھے تو ہاتھ اٹھا کر مانگتے تھے اور اس کے بعد چہرے پر ہاتھ مل لیا کرتے تھے۔ پھر حاکم نے مستدرک میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا اللہ کے سامنے عاجزی اور مسکنت کے اظہار کے لیے ہے۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص ہاتھ اٹھانے پر اعتراض کرتا ہے تو وہ دراصل ایک ایسی چیز پر اعتراض کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے ثابت ہے اور جس کے خلاف بجز قیاس اور گروہ بندی کے تعصب کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ اگر خدا سے ڈرتے ہیں تو وہ اپنی گروہ بندیوں اور اپنے گروہی شعاروں کی بہ نسبت سنت کو زیادہ وزنی سمجھیں۔

تاثرات اجتماع (دارالاسلام) کے تحت کچھ سوالات

سوال :۔ میں نے اجتماع کے موقع پر یہ محسوس کیا ہے کہ ہمارے رفقاء میں علمائے اسلام کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ ہم لوگ کہیں تعصب و تحزب میں مبتلا نہ ہو جائیں جیسے کہ پہلے بھی متعدد تحریکیں صحیح خطوط پر چل کر آخر کار فرقہ بندی پر جا ختم ہوئیں۔ اس فتنہ کا بروقت سدباب ہونا چاہیے۔ علماء اپنے رویہ میں ایک حد تک معذور ہیں کیونکہ انھوں نے ایک خاص ماحول میں دماغی تربیت پائی ہے اور ایک خاص طرز فکر سے وہ مسائل کو سوچنے کے عادی ہیں۔ ہمیں ان کی اس معذوری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

جواب :۔ علماء کے متعلق جس رویہ کی شکایت آپ نے کی ہے، وہ یقیناً ایک حد تک پایا جاتا ہے اور میں خود بھی اس کو محسوس کرتا ہوں لیکن ابھی تک میرے نزدیک وہ اپنی فطری حد کے اندر ہے۔ جب دین کے لیے کوئی کام کیا جائے اور وہ بالکل صحیح دینی طرز پر بھی ہو، اعتقادی و عملی حیثیت سے کوئی قباحت بھی اس میں نہ بتائی جا سکے اور کسی لوث یا غرض دنیوی کی نشاندہی بھی اس میں نہ کی گئی ہو اور پھر بھی علماء کی طرف سے اس کا صرف یہی نہیں کہ ساتھ نہ دیا جائے، بلکہ مخالفت کا رویہ اختیار کیا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس پر لوگوں کے رنجیدہ ہونے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور لوگ جب رنجیدہ ہوں تو ان کے رنج کا اظہار آخر کس شکل میں ہو؟ تاہم میں ہر وقت اس معاملہ میں چوکنا ہوں اور آپ یقین رکھیں کہ جب کبھی اسے قابل برداشت حد سے بڑھتا دیکھوں گا تو پوری قوت کے ساتھ روکوں گا

آپ خود چونکہ علماء کے اس گروہ سے وابستگی رکھتے ہیں اور کچھ نہ کچھ عقیدت مندی کی لگاوٹ بھی ابھی تک لگی ہوئی ہے، اس لیے ان حضرات کی غلط روش پر جن لوگوں کو رنج ہے، ان کے رنج پر تو آپ کو شکایت ہے، لیکن خود اس غلط روش پر آپ ان حضرات کو ایک حد تک معذور پاتے ہیں۔ کاش زمانہ کے سینہ میں بھی آپ کا سا دل ہوتا کہ وہ بھی اس قسم کی معذوریوں کا لحاظ کر کے کسی کے ساتھ

رحم کرنے پر تیار ہو جاتا! لیکن آپ یقین رکھیے کہ آپ کے دل میں غلط کاروں کے لیے خواہ کتنے ہی نرم گوشے ہوں، زمانہ ایسے نرم گوشے اپنے سینے میں نہیں رکھتا۔ جو غلطیاں ترکستان، ترکی اور ایران کے علماء نے کیں، ان پر زمانہ نے کوئی رعایت نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ علماء کے ساتھ اسلام بھی ڈوب گیا۔ اب جرمنی کی شکست اور روس کی فتح کی بدولت کمیونزم کو وہ طاقت حاصل ہو گئی ہے کہ جس خطرہ کا امکان میں نے سیاسی کشمکش حصہ اول میں ظاہر کیا تھا، وہ بالکل قریب آ پہنچا ہے۔ اب اگر علمائے کرام ہمارے چونکانے سے نہ چونکیں گے اور ہمارے سمجھانے سے نہ مانیں گے تو کمیونزم انھیں چونکائے گا اور افسوس یہ ہے کہ اس وقت چونکنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

سوال:۔ اجتماع میں شرکت کرنے اور مختلف جماعتوں کی رپورٹیں سننے سے مجھے اور میرے رفقا کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو گیا ہے کہ ہم نے جماعت کے لٹریچر کی اشاعت و تبلیغ میں بہت معمولی درجہ کا کام کیا ہے۔ اس سفر نے گذشتہ کوتاہیوں پر ندامت اور مستقبل میں کامل عزم و استقلال اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے پر آمادہ کر دیا ہے۔ دعا فرمائیں کہ جماعتی ذمہ داریاں پوری پابندی اور ہمت و جرأت کے ساتھ ادا ہوتی رہیں۔

اس امید افزا اور خوش کن منظر کے ساتھ اختتامی تقریر کے بعض فقرے میرے بعض ہمدرد رفقا کے لیے باعث تکدر ہی ثابت ہوئے اور دوسرے مقامات کے مخلص ارکان و ہمدردوں میں بھی بددلی پھیل گئی۔ عرض یہ ہے کہ منکرین خدا کا گروہ جب اپنی بیباکی اور دریدہ دہنی کے باوجود حلم، تحمل اور موعظۂ حسنہ کا مستحق ہے تو کیا یہ دینداروں کا متقشف تنگ نظر طبقہ اس سلوک کے لائق نہیں ہے؟ کیا ان کے اعتراضات و شبہات حکمت و موعظۂ حسنہ اور حلم و بردباری کے ذریعہ رفع نہیں کیے جا سکتے؟ اختتامی تقریر کے آخری فقرے کچھ مغلوبیت جذبات کا پتہ دے رہے تھے۔

تقریر کی صحت میں کلام نہیں صرف انداز تعبیر اور طرز بیان سے اختلاف ہے۔ قرآن کا اصول تبلیغ "فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ" سے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے ساری مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ آپ کی عام عادت تبلیغ و تفہیم میں حکیمانہ ہے۔ اسی بنا پر اس دفعہ خلاف عادت لب و لہجہ کو سخت دیکھ کر تعجب ہوا۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ حکمت و مصلحت شرعی کا تقاضا ہے کہ فروعی مسائل اور ظواہر سنن کی تغیر و تبدیل پر ابتداءً اصرار نہ کیا جائے اور نہ خود عملاً ایسا طرز اختیار کیا جائے جس سے مسلمانوں میں توحش و تنفر پیدا ہو۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل منافقین اور تغییر بنائے کعبہ سے محترز رہے۔ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اعفاء اور تقصیر لحیہ کے بارے میں سلف میں اختلاف پایا جاتا ہے اور جو طرز عمل آپ نے اختیار کیا ہے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ ادھر مقدار قبضہ تک اعفاء کے جواز سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ پھر کیا یہ مناسب اور حکیمانہ فعل نہ ہوگا کہ عوام کو توحش سے بچانے کے لیے آپ بھی اسی جواز پر عمل کر لیں، کیونکہ ظاہری وضع قطع میں جو غلو کی صورت ہے، اس کی اصلاح بنیادی امور اور مہمات مسائل کے ذہن نشین کرانے کے بعد بھی ہو سکتی ہے۔ جماعت اسلامی سے مخلصانہ وابستگی اور دلی تعلق کی بنا پر یہ چند سطور لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ غور فرمائیں گے۔

جواب:۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ اہل مذہب کے ساتھ بھی چاہتے ہیں کہ وہی سلوک کیا جائے جو منکرین کے ساتھ ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ آپ نے فقط نرمی ہی کو تقاضائے حکمت سمجھ رکھا ہے، حالانکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کے

مان لینے والوں سے جب خلاف حق باتوں کا صدور ہو تو ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہ نسبت مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے جو سرے سے حق کو نہ ماننے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ اور رسول نے جہاں بعض مواقع پر انتہائی نرمی برتی ہے اور وہ عین مقتضائے حکمت ہے، بعض دوسرے مواقع پر سخت لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے اور تیز و تند الفاظ سے بھی کام لیا ہے اور وہ بھی مقتضائے حکمت ہی رہا ہے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو باتیں میں نے آخری تقریر میں کہی ہیں، کیا ان میں کوئی لفظ خلاف حق تھا؟ نیز یہ کہ اس تقریر میں جو باتیں کہی گئی ہیں، کیا فی الواقع اس مرحلہ پر ان کا کہنا ضروری نہیں تھا؟ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو آپ اسے ضرور تحریر فرمائیں، لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ باتیں جو کہی گئی ہیں وہ حق تھیں اور لوگوں کو اصل مقتضیات دین کی طرف توجہ دلانے کے لیے اس وقت انھیں صاف صاف بیان کرنے کی ضرورت بھی تھی تو پھر لب و لہجہ کی شکایت فضول ہے۔ میں آپ کو اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں جذبات سے مغلوب ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ نرمی اور سختی جو کچھ بھی اختیار کرتا ہوں، جذبات کی بنا پر نہیں، بلکہ ٹھنڈے دل سے یہ رائے قائم کرنے کے بعد اختیار کرتا ہوں کہ اس موقع پر واقعی ایسا کرنا چاہیے۔

آپ کے سامنے صرف اپنا قریبی ماحول ہے، مگر مجھ پر جس ذمہ داری کا بار ہے، اس کی وجہ سے میں پوری جماعت اور تحریک کے حالات پر نگاہ رکھتا ہوں۔ مجھے یہ اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر اس موقع پر میں مقتضیات دین کو صاف اور واضح طریقہ پر بیان نہ کر دوں اور ان لوگوں کی غلطی کو بالکل کھول کر نہ رکھ دوں جو فروع کو اب تک اصل دین بنائے بیٹھے ہیں اور دین کے اصلی تقاضوں سے غفلت برتتے رہے ہیں تو اس کا نتیجہ ہماری تحریک کے حق میں نہایت مہلک ہوگا، کیونکہ اس قسم کا ایک اچھا خاصہ گروہ ہماری تحریک سے محض سطحی طور پر متاثر ہو کر ہماری طرف کھنچنے لگا ہے۔ لیکن اپنے سابق تعصبات اور اپنی سابق غلطیوں میں سے کسی چیز میں بھی ذرہ برابر ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ الٹا ہم سے طالب ہے کہ ہم بھی ان غلطیوں میں مبتلا ہو کر وہی خرابیاں برپا کریں جو یہ لوگ اصلاح کے نام سے کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر اس مرحلہ پر میں صاف صاف ان کو متنبہ نہ کر دیتا تو مجھے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ جماعت کے اندر اگر یا جماعت کے دروازہ پر کھڑے ہو کر ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے جن سے کام بننے کے بجائے الٹا خراب ہوتا۔ دراصل جو باتیں میری اس تقریر کو سننے کے بعد اس گروہ کے لوگوں نے کی ہیں، ان سے تو مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ یہ لوگ فی الواقع دین کے کسی کام کے نہیں اور یہ کہ ان کا ہمارے قریب آنا ان کے دور رہنے بلکہ مخالفت کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجیے کہ جو لوگ قرآن و سنت کے لحاظ سے میری تقریر کے اندر کوئی لفظ بھی قابل گرفت نہیں بتا سکتے، بلکہ اس کے برعکس جو یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ جس چیز کو میں نے دین کا اصل مدعا بتایا ہے، واقعی قرآن و سنت کی رو سے دین کا اصل مدعا وہی ہے اور جن چیزوں کو میں مقدم و موخر کر رہا ہوں وہ واقعی مقدم و موخر ہیں، مگر اس کے باوجود جنھیں میری اس تقریر پر اعتراض کرنے اور بدلی اور رنجش کا اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، وہ آخر کس قدر عزت کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات و خیالات کا لحاظ کیا جائے۔ ایسے لوگ دراصل بندۂ حق نہیں، بلکہ بندۂ نفس ہیں۔ ان کے اندر خدا کا اتنا خوف نہیں ہے کہ اپنی غلطیوں پر متنبہ ہونے کے بعد اپنی اصلاح کریں اور حق کے واضح طور پر سامنے آجانے کے بعد اسے قبول کریں۔ اس کے بجائے وہ شکایت یہ کرتے ہیں کہ حق بات انھیں صاف صاف کیوں کہہ دی گئی اور کہنے والا انہی تعصبات میں کیوں مبتلا نہیں ہے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگر منکرین میں سے ہوتے تو ہم ان کی رعایت کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے، مگر یہ لوگ اپنی اس نفس پرستی کے باوجود حق پرستوں کی صف اول میں کھڑے ہیں اور دینداری

ڈھونگ رچاتے ہیں، اس لیے نہ کسی رعایت کے مستحق ہیں اور نہ ایسے لوگوں کے دور ہوجانے پر کوئی ایسا شخص افسوس کرسکتا ہے جو حق کے لیے کام کرنا چاہتا ہے۔ یہ لوگ جو کچھ اب تک مذہب کے نام پر کرتے رہے ہیں، اس سے دین کی کوئی بات بن نہیں آئی ہے، بلکہ کچھ بگڑتا رہا ہے۔ اب میں نے چاہا کہ ان کو صاف صاف بتاؤں کہ اگر واقعی دین کی بات بنانا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ کیا ہے، اور تمہارے فہمِ دین میں کیا قصور ہے جس کی وجہ سے تم اب تک کچھ نہیں کرسکے۔ اگر یہ لوگ واقعی دین کے ساتھ کوئی قلبی تعلق رکھنے والے ہوتے تو میری باتیں سن کر ان کی آنکھیں کھل جاتیں اور ان کے اندر توبہ و انابت کا جذبہ پیدا ہوتا، لیکن اس کے بجائے یہ لوگ الٹا مجھ سے بگڑ گئے اور اب بھی ان کے نزدیک مرجح یہی ہے کہ انہی تعصبات اور جزئیات پرستیوں میں مبتلا رہیں جن میں اب تک مبتلا رہے ہیں۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ لینے کے بعد میں بہت خوش ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ یہ فتنہ پسند گروہ قریب آنے کے بجائے دور جا رہا ہے۔

اگر خدانخواستہ میں اس اجتماع کے موقع پر ان باتوں کو صاف صاف بیان کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھتا تو البتہ یہ میری ایسی کوتاہی ہوتی جس پر میں بعد میں افسوس کرتا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان لوگوں کو یہ توفیق ہی نہیں دینا چاہتا کہ یہ لوگ اس کے دین کی کوئی خدمت کریں۔ جن فتنوں کی یہ خدمت کرتے رہے ہیں، اللہ نے بھی غالباً یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ ان کو انہی فتنوں کی توفیق عطا فرماتا رہے۔

ڈاڑھی کے متعلق جو آپ نے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ میں اپنے عمل سے اس ذہنیت کو غذا دینا پسند نہیں کرتا جس نے بدعت کو عین سنت بنا دینے تک نوبت پہنچا دی ہے۔ میرے نزدیک کسی غیر منصوص چیز کو منصوص کی طرح قرار دینا اور کسی غیر مسنون چیز کو (جو اصطلاح شرعی کے لحاظ سے سنت نہ ہو) سنت قرار دینا بدعت ہے اور ان خطرناک بدعتوں میں سے ہے جو معلوم و معروف بدعتوں کی بہ نسبت زیادہ تحریفِ دین کی موجب ہوتی ہیں۔ اسی قبیل سے یہ ڈاڑھی کا معاملہ ہے۔ لوگوں نے غیر منصوص مقدار کو ایسی حیثیت دے دی ہے اور اس پر ایسا اصرار کرتے ہیں جیسا کسی منصوص چیز پر ہونا چاہیے، پھر اس سے زیادہ خطرناک غلطی یہ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کو بعینہٖ وہ سنت قرار دیتے ہیں جس کے قائم و جاری کرنے کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے، درانحالیکہ جو امور آپ نے عادۃً کیے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں، اللہ اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ تحریف جو دین میں کی جا رہی ہے، اگر میں اس کے آگے سپر ڈال دوں اور جس وضع اور قطع میں لوگ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، اس میں اپنے آپ کو ڈھال لوں تو میرے نزدیک میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ہوں گا جس کے لیے اللہ کے یہاں مجھ سے سخت باز پرس ہوگی اور اس باز پرس میں کوئی میری مدد کے لیے نہ آسکے گا۔ لہٰذا میں اپنے آپ کو لوگوں کے مذاق کے خلاف بنائے رکھنا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بجائے اس کے کہ اپنے آپ کو اس اخروی خطرے میں ڈالوں۔

سوال:- حالیہ اجتماعِ دار الاسلام کے بعد میں نے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب بھی اقامتِ دین کے فریضہ کو فوق الفرائض بلکہ اصل الفرائض اور اسی راہ میں جدوجہد کرنے کو تقوٰی کی روح سمجھنے کے بعد عرض ہے کہ "مظاہرِ تقوٰی" کی اہمیت کی نفی میں جو شدت آپ نے اپنی اختتامی تقریر میں برتی تھی وہ ناتربیت یافتہ ارکین جماعت میں "عدمِ اعتنا بالسنۃ" کے جذبات پیدا کرنے کا موجب ہوگی، اور میں دیانۃً عرض کرتا ہوں کہ اس کے مظاہر میں نے بعد از اجلاس ملاحظہ کیے۔ اس شدت کا نتیجہ بیرونی حلقوں میں اور واقعیہ ہوگا کہ تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جائے گا، کیونکہ اس سے پہلے بھی بعض داعیین تحریکات "استہزا بالسنۃ" کی ابتدا اسی طرح کی تھی کہ بعض مظاہر

تقویٰ کو اہمیت دینے اور ان کا مطالبہ کرنے میں شدت اختیار کرنے کی مخالفت جوش و خروش سے کی۔ دوسرے یہ کہ شرارت پسند عناصر کو ہم خود گویا ایک ایسا ہوائی پستول فراہم کر دیں گے جو چاہے درحقیقت گولی چلانے کا کام ہرگز نہ کر سکے مگر اس کے فائر کی نمائشی آواز سے حق کی طرف بڑھنے والوں کو بدکایا جا سکے گا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملات میں عوام کے مبتلائے فتنہ ہو سکنے کا لحاظ رکھا ہے۔ چنانچہ بیت اللہ کی عمارت کی اصلاح کا پروگرام حضورؐ نے محض قوم کی جہالت اور جدید العہد بالاسلام ہونے کے باعث ملتوی کر دیا تھا اور پھر اتنی احتیاط برتی کہ کبھی کسی وعظ اور خطبہ میں لوگوں کو اس کی طرف توجہ تک نہیں دلائی۔ بجز اس کے کہ دورانِ خانہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ نے اس کا تذکرہ ایک دفعہ کیا۔

علاوہ بریں مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں بھی دوسرے مسائل کی طرح خود داعی و مصلح اول صلوٰۃ اللہ علیہ کے ذاتی اسوہ کا اتباع ہی راہ ہدایت ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد یہ روایت مدنظر رکھیے کہ "کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کث اللحیۃ یملأ صدرہ" اس اسوۂ رسول کا اتباع کرتے ہوئے اگر آپ افراط و تفریط کی اصلاح کریں تو پھر ادھر تو معترضین کو عیب چینی کے مواقع کم ملیں گے اور اُدھر مغربیت زدہ لوگوں کے لیے طغیان نفس و ہائے اطاعت کے لیے کمتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی بنا پر میں نے بوقت ملاقات عرض کیا تھا کہ آپ کا ذاتی تعامل باعفاء اللحیہ و دیگر پہلوؤں سے تکمیل ظواہر سنن بالیقین دین کے لیے مفید ہوگا۔ اس کا خیال رہے کہ ادھر مذہبی مخالفین کا گروہ ہے جس کی اصلاح اس انداز سے کرنی ہے کہ مختلف امور دین کو ان کے اصل مقام پر رکھ کر انھیں ان کی صحیح حیثیت اور ان کی صحیح اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ لیکن دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جس کے نزدیک مظاہر تقویٰ کے معاملہ میں سنت انبیاء خصوصاً داڑھی کی سنت کا اتباع کرنا نہ صرف غیر ضروری، بلکہ ذریعۂ نفرت و تمسخر ہے۔ اس گروہ کی اصلاح بھی تو آخر ہمارے ہی ذمہ ہے، تو پھر کیا یہ فرض پورا کرنے کے لیے وہی اثباتی شدت زیادہ کارآمد نہیں ہے جو مظاہر تقویٰ کے تحفظ میں قدیم دیندار طبقہ کی تلقین کی روح تھی؟

فریدیہ کہ ہم اسلام کی اساسی حقیقتوں ہی کو جب پوری وسعت سے نہیں پھیلا چکے ہیں اور ابھی بے شمار بندگانِ خدا کے سینوں میں اترنے کی مہم سر کرنی باقی ہے تو کیا بہتر یہ نہ ہوگا کہ ہم فروعی امور کے کانٹوں سے دامن بچا کر بڑھتے جائیں اور اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہوئے اپنا ایک لحظہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ ورنہ مجھے خطرہ ہے کہ ہم لوگ جن کا دن رات واسطہ متلاشیانِ اعوجاج و متبغیانِ فتنہ و تاویل سے ہے، صرف انھیں زائد از ضرورت مسائل میں الجھ کر رہ جائیں گے اور اصل مقصد فوت ہو جائے گا۔ پس بہتر یہی ہے کہ "مظاہر تقویٰ" وغیرہ قسم کے مباحث پر تحریروں اور تقریروں میں درشت اور شدید طریقہ سے بحث نہ کی جائے۔

جواب:- آپ نے جو امور تحریر فرمائے ہیں ان میں سے بیشتر کے جواب میں نے زبانی عرض کر دیے تھے اور اب بھی اپنے ان زبانی جوابات پر کسی اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم ایک دو امور اس سلسلہ میں ایسے ہیں جن پر مختصراً کچھ اشارہ کرنا کافی سمجھتا ہوں۔

آپ نے بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ مظاہر تقویٰ کے متعلق میں نے کوئی شدت برتی ہے جو سنت کے استہزا کی تمہید بن سکتی ہے اور بعض لوگوں کے لیے سنت سے بے اعتنائی کی موجب ہوئی ہے۔ کیا آپ براہ کرم بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سے الفاظ تھے جن کو آپ

شدت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر الفاظ آپ کو یاد نہ ہوں تو آپ تھوڑا صبر فرمائیں، میں اپنی اس تقریر کو قلمبند کرا کے انشاء اللہ عنقریب شائع کردوں گا اس وقت آپ اسے پڑھ لیجیے گا اور میرے وہ الفاظ نشان لگا کر میرے پاس بھیج دیجیے گا جن میں شدت پائی جائے[1]۔ اسی طرح جن اراکین سے آپ کا تبادلۂ خیال ہوا اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ میری اس تقریر کی بدولت ان میں سنت سے عدم اعتنا پیدا ہوا ہے، اگر آپ کو ان کے نام یاد ہوں یا کم سے کم یہی یاد ہو کہ وہ کس جگہ کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے تو مجھے لکھ دیجیے تاکہ میں پوری طرح تشخیص کر سکوں کہ آیا ان کے متعلق آپ کا اندازہ غلط تھا یا میرے متعلق ان کا اندازہ۔

کیا آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اس جماعت میں داخل ہونے کے بعد جن لوگوں کے چہرے پر داڑھی آئی ہے، اتباع سنت کی تبلیغ کا دعویٰ رکھنے والے حضرات میں سے کسی کی تبلیغ سے ان کے چہرے کبھی داڑھی سے مزین نہیں ہو سکتے تھے حالانکہ جماعت میں آنے کے بعد ہم نے کبھی ان سے داڑھی یا دوسرے مظاہر تقویٰ کے متعلق اشارۃً بھی نہیں کہا کہ وہ فلاں چیز پر عمل کریں۔ باوجود اس کے ان لوگوں نے جو کبھی خواب میں بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ ان کے چہرے پر داڑھی ہو، خود بخود داڑھیاں رکھ لیں اور اپنے فیشن تبدیل کرنے شروع کر دئے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم نے اسی اصل چیز کی تعلیم و تلقین پر سارا زور صرف کیا جو پوری دیندارانہ زندگی کی جڑ ہے، یعنی خدا اور رسول کی وفاداری و اطاعت؛ اس کے بعد ہمیں کسی چیز کی الگ الگ تلقین کی ضرورت نہ رہی۔ جس جس بات کے متعلق ان کو معلوم ہوتا گیا کہ خدا و رسول کا حکم یہ ہے یا خدا اور رسول کو یہ پسند ہے، اسے اختیار کرنے پر وہ اپنے نفس کو مجبور کرتے چلے گئے اور جس جس کے متعلق یہ معلوم ہوتا گیا کہ یہ خدا اور رسول کو ناپسند ہے، اسے وہ خود بخود چھوڑتے چلے گئے۔ اس سلسلے میں ان کے اندر وہی تبدیلیاں نہیں ہوئیں جو آپ لوگوں کے نزدیک اتباع سنت رہی ہیں، بلکہ وہ تبدیلیاں بھی ہوئیں جن کے متعلق دین ہونے کے تصور سے بہت سے دورِ آخر کے پیشوایانِ دین تک خالی رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ لینے کے بعد جب آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ تیری باتوں سے لوگوں میں سنت سے عدم اعتنا اور استہزا کی کیفیت پیدا ہوگی یا ہوئی تو مجھے حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے۔ میں نے تو مجبور ہو کر بلکہ تنگ آ کر صاف صاف بات اس وقت کہی ہے جب کہ ایک گروہ نے اپنے طرزِ عمل سے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ایک طرف وہ ہماری دعوت پر لبیک کہتا ہوا آگے بھی بڑھتا ہے اور دوسری طرف جزئیات کو اصول و کلیات پر مقدم رکھنے اور تقریر، تحریر اور بحث و جدال کا سارا زور انھیں پر صرف کرنے کی پرانی بیماری بھی اس کو لگی ہوئی ہے۔ اس سے مجھے خطرہ ہوا کہ اس بیماری کو لیے ہوئے اگر یہ گروہ جماعت میں آ گیا تو یہاں پھر وہی سب کچھ ہونے لگے گا جو باہر مذہبی میدان میں ہوتا رہا ہے۔ اس لیے مجھے مجبوراً یہ بتا دینا پڑا کہ ایسے لوگ ہمارے کسی کام کے نہیں ہیں اور ہماری دعوت کا مزاج ان کی افتادِ مزاج سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اگر اپنے دماغ کی اصلاح کر کے اور اپنے فہم دین کو درست کر کے آنا چاہیں تو بسر و چشم، ما روشن، دل ماشاد! لیکن اگر وہ جماعت میں آ کر یا جماعت میں رہ کر وہی سب کچھ کرنا چاہتے ہیں جو اس سے پہلے کرتے رہے ہیں اور جس کی بدولت دین کا کچھ کام بنانے کے بجائے کچھ بگاڑتے ہی رہے ہیں تو بہتر ہے کہ وہ ہماری اس جماعت کو خراب کرنے کے بجائے اپنے پرانے مشاغل باہر ہی رہ کر جاری رکھیں۔

اس وجہ سے جو کچھ میں نے کیا اور جو کچھ میں نے کہا، خوب سوچ سمجھ کر ہی کیا اور کہا۔ خدا کے فضل سے میں کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور کہا کرتا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے، تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے

---

[1] وہ تقریر اسی اشاعت میں بسلسلۂ روداد اجتماع درج ہے۔

کہ اس کا حساب مجھے خدا کو دینا ہے، نہ کہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلاف حق نہیں کہا اور جو کچھ کہا اسی کا کہنا خدمت دین کے اس مرحلے پر ناگزیر تھا۔ اس کے کہنے پر نہیں، بلکہ نہ کہنے پر مجھے اندیشہ تھا کہ میں ماخوذ ہوں گا۔ اب بھی جو باتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں ان میں بھی کوئی ایک چیز ایسی نہیں ہے جس سے مجھے اپنی اس رائے میں ترمیم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

میں نے آپ سے زبانی بھی عرض کیا تھا اور اب تحریراً بھی عرض کرتا ہوں کہ میں دین کو جو کچھ سمجھتا ہوں اور شریعت کے متعلق جو کچھ مجھے علم ہے، اس کی بنا پر میرا یہ فرض ہے کہ نہ صرف اپنے قول سے، بلکہ اپنے عمل سے بھی ان غلطیوں کی اصلاح کروں جو شریعت کے بارے میں لوگوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ محض لوگوں کے مذاق کی رعایت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس میں وہ مجھے رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کو اس غلط فہمی میں ڈالنا کہ شریعت کے اصل تقاضے وہی ہیں جو انھوں نے سمجھ رکھے ہیں، میرے نزدیک گناہ ہے۔ میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات کے ان مفہومات کو غلط، بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے، اتنی ہی بڑی داڑھی رکھنا سنت رسول یا اسوۂ رسول ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو بعینہٖ وہ سنت سمجھتے ہیں جس کے جاری اور قائم کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا علیہم السلام مبعوث کیے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں ہے، بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریف دین ہے جس سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔

آپ کو اختیار ہے کہ میری اس رائے سے اتفاق نہ کریں، لیکن جب تک میں اپنے مطالعۂ کتاب و سنت کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں، اس وقت تک آپ لوگوں کا یہ مطالبہ کرنا کہ میں اپنے عقیدہ و علم کے خلاف آپ لوگوں کی مزعومہ سنتوں کو اختیار کروں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں آپ لوگ جب مجھے یہ اندیشہ دلاتے ہیں کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہوں گے اور یہ چیز ان کے دعوت کی طرف آنے میں مانع ہوگی تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ لوگ میری دعوت الی اللہ کے جواب میں مجھ کو اپنی دعوت الی الناس دینا چاہتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر حق اور غیر حق کی اتنی تمیز بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ میں جس چیز کی طرف انھیں بلا رہا ہوں، وہ دین میں کیا مقام رکھتی ہے اور وہ جن باتوں کی وجہ سے میری دعوت کو قبول کرنے میں تامل یا انکار کر رہے ہیں ان کا دین میں کیا درجہ ہے، ایسے ناحق شناس اور خدا پرستی کے بھیس میں اپنے تخیلات کو پوجنے والے لوگ آخر کس وزن اور قدر کے مستحق ہیں کہ ان کے جذبات اور ان کے خیالات کی کوئی رعایت کی جائے۔

سوال: اسی سلسلہ میں ایک اور اہم چیز کی طرف توجہ دلانے پر مجبور ہوں۔ اگرچہ وہ "بڑی بات" ہی ہے اور یہ جرأت کرتے وقت "خود را بشناس" کا آوازہ سن رہا ہوں، لیکن نصب العین کی محبت کا غلبہ کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اگر اس جسارت پر ملال ہو تو معاف کیا جاؤں وذالک ھو المرجو من کرمکم ـــ اور وہ یہ ہے کہ اسوۂ داعی الی اللہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات اپنے رفقاء سے یوں تھا کہ "کان ھو کاحدھم" یا "عزیز علیہ ما عنتم" نیز "حریص علیکم" اور "بالمومنین رؤف الرحیم"۔ اس حیثیت میں موجودہ بے بسی زمانہ کی

تمنا کی جا رہی ہے۔ اللھم ارزقنا حبك وحب من یحبك

جواب:۔ آپ نے جو امور خط کے اس دوسرے حصہ میں تحریر فرمائے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ ان کی ذرا کچھ تفصیل ارشاد فرمائیں۔ میں نے اپنی حد تک اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ جماعت کے لوگوں میں میں اس طرح رہوں اور ایسا رویہ رکھوں جس میں امتیاز کی بو تک نہ ہو اور میرے اور ان کے درمیان وہی مساوات پائی جائے جو اسلام کا تقاضا ہے، لیکن مجھے یہ معلوم ہے کہ ایک گروہ میں ایسی مساوات کی خواہش رہی ہے جو نہ دین کا تقاضا ہے اور نہ عملاً وہ ممکن ہے۔ اور ایسی مساوات نہ ہونے پر ان کے اندر بددلی و بے اطمینانی پیدا ہوتی رہی ہے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ اس بددلی اور بے اطمینانی کی بنا پر جو پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے اور جس کا مرکز...... بھی رہا ہے، شاید اس کے اثرات آپ تک بھی پہنچے ہیں۔ اگر ایسی کوئی چیز مدنظر ہو تو اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر آپ نے کوئی ایسی چیز پائی ہے جو تقاضائے دین و شریعت تھی اور اس کے لحاظ سے میرے طرز عمل میں کوئی کوتاہی آپ کو نظر آئی ہے تو اس سے مجھے ضرور مطلع فرمائیے تاکہ میں اس کی اصلاح کر سکوں۔ جہاں تک دین و شریعت کے مطالبات ہیں ان کو پورا کرنا میرا فرض ہے اور ان کے لحاظ سے کسی قصور و کوتاہی میں مبتلا ہونا میں گناہ سمجھتا ہوں، لیکن میرے لیے یہ بات سخت تکلیف کی موجب ہے کہ بہت سے لوگ مجھ سے اپنی خواہشات کا اتباع کرانا چاہتے ہیں اور اسے رسول اللہ کے نام سے کرتے ہیں۔

داڑھی کی مقدار کا مسئلہ

سوال:۔ داڑھی کی مقدار کے عدم تعین پر "ترجمان" میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے مجھے تشویش ہے، کیونکہ بہت بڑے علماء کا متفقہ فتویٰ اس پر موجود ہے کہ داڑھی ایک مشت بھر لمبی ہونی چاہیے اور اس سے کم داڑھی رکھنے والا فاسق ہے۔ آپ آخر کن دلائل کی بنا پر اس "اجماعی فتویٰ" کو رد کرتے ہیں؟

جواب:۔ یہ تو انھیں علماء سے پوچھنا چاہیے کہ ان کے پاس مقدار کے تعین کے لیے کیا دلیل ہے؟ اور خصوصاً "فسق" کی وہ آخر کیا تعریف کرتے ہیں جس کی بنا پر ان کی تعین کردہ مقدار سے کم داڑھی رکھنے والے پر فاسق کا اطلاق ہو سکتا ہے؟ مجھے سخت افسوس ہے کہ بڑے بڑے علماء "خود حدود شرعیہ" کو نہیں سمجھتے اور ایسے فتوے دیتے ہیں جو صریحاً حدود شرعیہ سے متجاوز ہیں۔

داڑھی کے متعلق شارع نے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ علماء نے جو حد مقرر کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بہرحال ایک استنباطی چیز ہے اور کوئی استنباط کیا ہوا حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو نص کی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو اگر فاسق کہا جا سکتا ہے تو صرف حکم منصوص کی خلاف ورزی پر کہا جا سکتا ہے۔ حکم مستنبط کی خلاف ورزی (چاہے استنباط کیسے ہی بڑے علماء کا ہو) فسق کی تعریف میں نہیں آتی، ورنہ اسے فسق قرار دینے کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ استنباط کرنے والوں کی بھی شریعت میں وہی حیثیت ہے جو خود شارع کی ہے۔

سوال:۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کسی صحابی کی داڑھی ایک مشت سے کم تھی؟

جواب:۔ اسماء الرجال اور سیر کی کتابوں میں تلاش کرنے سے مجھے بجز دو تین صحابیوں کے کسی کی داڑھی کی مقدار نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ صحابہ کے حالات پر صفحے کے صفحے لکھے گئے ہیں مگر ان کے متعلق یہ نہیں لکھا گیا کہ ان کی داڑھی کتنی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سلف میں یہ مقدار کا مسئلہ کتنا غیر اہم اور ناقابل توجہ تھا۔ حالانکہ متاخرین میں جس شدت سے اس پر زور دیا جاتا ہے اتنے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید مومن کی سیرت و کردار میں پہلی چیز جس کی جستجو ہونی چاہیے وہ یہی ہے کہ اس کی داڑھی کا طول کتنا ہے۔

سوال: - داڑھی کی مقدار کے عدم تعین کا جو مسئلہ ہماری جماعت میں پھیل نکلا ہے، اس کے ماتحت بعض رفقاء نے اپنی داڑھیاں پہلے سے چھوٹی کرالی ہیں اور اب ان خشخشی داڑھیوں کے متعلق یہ خوشخبری ہے کہ کہیں "احمدی داڑھی" کی طرح ان کی بھی کوئی فرقی نام نہ پڑ جائے اور عوام کے لیے یہ چیز فتنہ ثابت ہو۔ چونکہ علماء کا متواتر تعامل مشت بھر داڑھی رکھنے کا ہے، اس وجہ سے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں بھی اس کا التزام کرنا چاہیے۔

جواب: - آپ کا قلب جس چیز کے اوپر گواہی دے، آپ کو خود اس پر عمل کرنا چاہیے، لیکن اسی چیز کو دوسروں کے لیے ضابطہ بنانے کی خواہش نہ ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک کسی کی داڑھی کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اصل چیز جو آدمی کے ایمان کی کمی اور بیشی پر دلالت کرتی ہے وہ تو اور ہی ہے۔ البتہ مجھے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایمان کی کمی کو بعض ظاہری چیزوں کی بیشی سے پورا کرنے کی اب تک کوششیں کی جاتی رہی ہیں، کہیں ہماری جماعت کے بھی کچھ لوگ اسی مرض میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اگر کسی کی حقیقی جاں نثاری و وفاداری اللہ کی راہ میں "طویل" ہو تو کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے گا، اگر اس کی داڑھی "قصیر" ہو، لیکن اگر جاں نثاری و وفاداری "قصیر" ہے تو یقین رکھیے کہ داڑھی کا طول کچھ بھی فائدہ نہ دے گا۔ بلکہ بعید نہیں کہ خدا کے ہاں اس پر فریب کاری اور مکاری کا مقدمہ چل جائے۔

آپ اس کی فکر نہ کیجیے کہ ہماری جماعت کے ارکان کے متعلق لوگ کیا رائے قائم کریں گے اور ان کے ظاہر سے کیا اثر لیں گے۔ آپ کو اور ہمارے تمام رفقاء کو اپنے باطن کی فکر اپنے ظاہر سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور اسی طرح اپنے ان اعمال کی زیادہ فکر کرنی چاہیے جن پر خدا کی میزان میں آدمی کے ہلکے یا بھاری ہونے کا مدار ہے، کیونکہ اگر ایسے اعمال ہلکے رہ گئے تو بال برابر وزن رکھنے والی چیزوں کی کمی و بیشی سے میزان الٰہی میں کوئی خاص فرق واقع ہونے کی توقع نہیں ہے۔

مسلک تشیع اور ترجمان القرآن

سوال: - ترجمان القرآن یوں تو اعلیٰ درجہ کا دینی پرچہ ہے، مگر شیعوں کے اعتراضات اور غلط خیالات کی تردید اس میں نہیں ہوتی۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: - ترجمان القرآن کوئی فرقہ وارانہ پرچہ نہیں ہے کہ وہ مناظروں کا میدان بنا رہے۔ اس کا مقصد اشاعت تحریک اسلامی کو اس کی اصلی شکل میں زندہ کرنا ہے اور وہ ایک اثباتی دعوت کا علمبردار ہے۔ اس اثباتی دعوت کے خلاف نیک نیتی سے جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیش کیے جاتے ہیں، چاہے وہ شیعوں کی طرف سے ہوں یا سنیوں کی طرف سے، اہل حدیث انھیں پیش کریں یا حنفی، اسی طرح مسلمان اس کی دعوت کو سمجھنے کے لیے کوئی استفسار کریں یا ہندو اور سکھ، سبھی کا جواب دیا جاتا ہے۔ مگر فرقہ وارانہ عصبیت رکھنے والے پرچوں کی طرح یہ صورت یہاں نہیں ہے کہ اصل دین چاہے کتنا ہی ساقط الاعتبار ہوتا چلا جائے، اس کے معاملے سے قطع نظر کر کے فقہی اور کلامی جزئیات پر محض نظری بحث کا سلسلہ جاری رہے۔

ہماری اثباتی دعوت خود ہی مختلف فرقِ باطلہ کے غلط نظریات پر شدید ضرب لگاتی ہے۔ ابطال باطل کے اس ایجابی طریقہ کو چھوڑ کر اگر سلبی انداز اختیار کیا جائے تو آخر کس کس گروہ کے عقیدۂ فاسد اور عمل باطل کے خلاف ہم لڑتے رہیں گے۔ اس طرح تو غالباً دس صدیاں

بھی حصولِ مقصد کے لیے ناکافی ہوں گی۔ سیدھی بات ہے کہ جب ہم تعین سے یہ کہتے ہیں کہ حق صرف یہ ہے تو اس سے از خود یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ اس "یہ" کے خلاف جو کچھ ہے باطل ہے۔

سوال:۔ حکومتِ الٰہیہ میں شیعوں کی حیثیت کے متعلق ایک سوال کا جو جواب ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے، اس کا مقصد میں نہیں پا سکا ہوں۔ کیونکہ ایک طرف آپ نے خود ہی یہ تسلیم کیا ہے کہ دورِ رسالت سے خلافتِ راشدہ تک مسلمان ایک ہی گروہ تھے اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے فرقوں کا وجود ہی ثابت نہیں، لیکن دوسری طرف مذکورہ بالا جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ اہلِ تشیع اور دوسرے گمراہ فرقوں کو دائرۂ اسلام ہی میں رکھتے ہیں۔ براہ کرم اپنے نظریہ کی وضاحت فرمایئے، اور یہ بھی لکھیے کہ اصولی اختلافات سے آپ کی کیا مراد ہے۔

جواب:۔ میں نے اپنے اس جواب میں یہ تو صاف صاف واضح کر دیا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں اصولی اختلاف رکھنے والے فرقوں کا وجود نہ تھا اور نہ اسلام یعنی کتاب اللہ اور سنت نبوی نے انھیں گوارا کیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اصولی اختلاف کی بنا پر جو فرقہ بھی بنے گا، وہ امتِ مسلمہ کا جز شمار نہیں ہوگا۔ رہا یہ سوال کہ ایسے فرقوں کو عملاً حکومتِ الٰہیہ کے زیرِ سایہ کیا حیثیت دی جائے گی (یعنی انھیں اہلِ کتاب میں شمار کیا جائے گا یا ذمیوں میں) تو یہ سوال دراصل اس وقت کا ہے ہی نہیں۔ یہ سوال جب عملاً پیش آئے گا تو اس کا حل بھی ان شاء اللہ ہو ہی جائے گا۔ قبل از وقت آخر کیوں ایک فرقہ سے اس کی حیثیت کے متعلق بحث کے دروازے کھول کر وقت ضائع کیا جائے۔

اصولی اختلاف سے ہماری مراد یہ ہے کہ عقیدۂ توحید، حیثیتِ رسالت اور نظریۂ معاد کو جس طرح قرآن نے پیش کیا ہے، اس کے خلاف کوئی اور خیال اَدائی دین کی اساس میں شامل کی جائے اور پھر اس بنیادی تغیر کے بعد ان عقائد ولیہ کے تقاضوں اور فرائض و واجباتِ دین میں کوئی کمی یا بیشی کی جائے۔ ان اساسی معتقدات اور ان کے صریح مقتضیات کو ہم نے دستورِ جماعتِ اسلامی میں پیش کر دیا ہے۔ جو گروہ قرآن کی نصوصِ قطعیہ سے مرتب کیے ہوئے اس دستورِ جماعتِ اسلامی کی حدود کے اندر ہیں، انھیں ہم امتِ مسلمہ کے اندر شمار کرتے ہیں اور جن لوگوں نے ان حدود کو پھاندا ہے، انھیں دائرۂ امت کے باہر سمجھنے پر مجبور ہیں۔ ہاں ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استنباطی اور اجتہادی امور میں جائز حد تک اگر کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ سے جزئی اختلافات رکھتا ہے تو ایسے اختلافات مخصوص ہدایات اور اسوۂ صحابہ کی روشنی میں جائز قرار دیے جائیں گے، بشرطیکہ ان اختلافات کو جداگانہ جماعت بندی اور امت سازی کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

سوال:۔ ایک شیعہ دوست جو آپ کے مداح اور جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے قدرے متعارف ہیں، نماز باجماعت کے متعلق عجیب مسلک رکھتے ہیں، یعنی یہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کے لیے تیار ہوں، مگر وہ یہ شکل اختیار کرنے سے اس اصول کی بنا پر بھاگتے ہیں کہ امامِ نماز کو معصوم ہونا چاہیے۔ میں نے اس سلسلہ میں ترجمان القرآن کے بعض رسائل و مسائل میں سے کچھ اجزا انھیں نماز باجماعت کی اہمیت اور غیر معصوم امام کے پیچھے نماز پڑھنے کی گنجائش تسلیم کرانے کے لیے سنائے۔ مگر وہ کسی طرح نہیں مانتے۔ فرمایئے انھیں کس طرح سمجھاؤں۔

جواب:۔ امامِ معصوم کا عقیدہ جس نے شیعوں میں رواج پایا اور جس پر درحقیقت مسلکِ تشیع کی بنیاد قائم ہے اپنی اصل کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ بے اصل ہے، بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے، جس سے اس نے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کو

دین اور اس کے مطالبات اور اس کے مہمات کو عملاً معطل کر دیا ہے۔ اس نے امامت کے لیے معصومیت کی ایسی شرط لگائی جس کا متحقق ہونا اور دائماً و مستقلاً متحقق ہوتے رہنے غیر ممکن تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرون ماضیہ میں بھی جبکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ائمہ معصومین ظاہر ہوتے رہے، ہر امام کی وفات کے بعد اختلاف واقع ہوا کہ اس کی جگہ کونسا امام معصوم ہے اور اسی مسئلہ پر ہر امام کے بعد کئی کئی فرقے بنتے رہے اور بعد میں جب "آخری امام معصوم" غائب ہوئے تو کئی صدیوں سے عملاً دین کے تمام مہمات بلکہ وہ سارے کام جو دین کی اصلی روح ہیں، آج تک معطل چلے آرہے ہیں، کیونکہ یہ سب کام امام معصوم پر منحصر ہیں اور امام معصوم غائب ہے۔ اگر اس پر شیعہ حضرات متنبہ نہیں ہوتے اور شیطانی دھوکہ میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ صبر کریں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہیں۔

سوال:۔ اگر کوئی شیعہ دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو قولاً اور عملاً تسلیم کرلے تو کیا وہ شیعہ رہتے ہوئے جماعت اسلامی کا رکن بن سکتا ہے۔؟

جواب:۔ دستور جماعت اسلامی کے پورے مطالبات کو تسلیم کرلینے اور ان پر عمل پیرا ہو جانے کے بعد کوئی شخص شیعہ رہ ہی کہاں سکتا ہے۔ وہ تو پھر ویسا ہی خالص مسلمان ہوگا جیسے اس دستور کو تسلیم کرنے والے دوسرے اراکین ہیں۔ اور یہ کچھ شیعوں کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھکر قبول کرے جس کی تشریح ہمارے دستور میں کی گئی ہے اس کے اوپر سے تمام فرقی لیبل آپ سے آپ اتر جاتے ہیں اور وہ نرا مسلمان رہ جاتا ہے۔

ہندو دوست کا خط اور جواب

ہماری تحریک سے دلچسپی لینے والے ایک ہندو کرمفرما کے ایک دو گرامی نامے مع جواب ترجمان القرآن کی گذشتہ اشاعتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل وہ بعض اہم مسائل پر امیر جماعت سے گفتگو کرنے کے لیے مرکز میں تشریف لائے تھے۔ یہاں سے واپس ہونے کے بعد موصوف نے جماعتی لٹریچر کا مزید مطالعہ کیا ہے اور اسی مطالعہ کے تاثرات کے ماتحت ایک مفصل اور دلچسپ خط مرکز کو بھیجا ہے۔ جسے ذیل میں مع جواب درج کیا جارہا ہے:۔

دیر کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ اس طویل غیر حاضری کی وجہ صرف یہ خیال تھا کہ آپ کی جملہ تصنیفات کو مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کو آپ کی خدمت میں وضاحت سے پیش کرسکوں گا۔ سو اب آپ کی کلیات کا ایک مرتبہ سرسری مطالعہ کرچکا ہوں۔ فی الحقیقت اپنے مشن کے لیے جہاں تک اخلاص کا تعلق ہے، میں نے آپ کو شری ..... کے بعد دوسرا پہلا اور آخری رہنما پایا ہے۔ "آخری" کا لفظ میں جان بوجھ کر استعمال کیا ہے۔ شری ..... جی جنھیں میں موجودہ دور میں ہندوؤں کی عظیم ترین شخصیت سمجھتا ہوں، کی ذات بابرکات کے لیے اپنے دل میں انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے مشن کی تکمیل ہندو قوم پر جاکر ختم ہوتی ہے۔ ہندو قومیت میں کونسے عناصر شامل ہیں یا ہندو پن کیا ہے؟ ــــ اس کی تسلی بخش تفسیر آج تک نہیں ہو سکی۔ گوشت خور بھی ہندو اور گوشت کا تارک بھی ہندو، وید مقدس کو ماننے والا بھی ہندو اور ویدوں کا منکر بھی ہندو، گائے کا پجاری بھی ہندو اور گائے کے چمڑے کے جوتے

بنانے والا اور گانے کے پڑے کے ساز و سامان سے گھر کو زینت دینے والا بھی ہندو، بتوں کا پجاری بھی ہندو اور بتوں کا کھنڈن کرنے والا بھی ہندو، آستک بھی ہندو اور ناستک بھی ہندو، کروڑوں دیویوں دیوتاؤں کا ماننے والا بھی ہندو اور توحید کا قائل بھی ہندو ــــ جو قطعی ایک دوسرے کی ضد ہیں! بھائی پرمانند جی نے اسی لیے ہندو کی ایک دو حرفی تعریف کی ہے کہ "جو اپنے آپ کو ہندو سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ ویر ساورکر نے پریٹیکل طور پر یہ تشریح کی ہے کہ "جو اس دیش کو ماتری بھومی اور پنیہ بھومی سمجھتا ہے وہ ہندو ہے"۔ کچھ قوم پرست مسلمان اس ملک کو ماتری بھومی تو ماننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں مگر پنیہ بھومی نہیں! تو اس طرح مسلمانوں کا سوال جوں کا توں رہا۔ اور ہندوستان میں یہی ایک مسئلہ ہے جس کے حل کرنے پر ملک کے بہترین دماغ لگے ہوئے ہیں۔ آپ نے جو حل اس کا تجویز کیا ہے وہ فی الواقع نہ صرف مسلمان، نہ صرف ہندو، نہ صرف ہندوستان، بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے یکسانیت رکھتا ہے۔ چند ایک بنیادی اصول ہیں جن کے ماننے والے ایک طرف، نہ ماننے والے دوسری طرف۔ ایک دو ٹوک (Clear cut) واضح پالیسی ہے۔ (اسی لیے میں نے آپ کے لیے "آخری" کا لفظ اوپر استعمال کیا ہے)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ کی کلیات کا ایک نظر سے مطالعہ کر لیا ہے۔ آپ نے جو خطبات تعلیمی درسگاہوں میں پڑھے ہیں اور موجودہ یونیورسٹیوں کو قتل گاہوں (Slaughter Houses) سے مناسبت دے کر حقیقت کا اظہار فرمایا ہے۔ اس تلخ صداقت کو بے نقاب کر کے آپ نے جس اخلاقی جرأت اور دلیری کا ثبوت دیا ہے، اس کی جس قدر تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں آپ کے ان خطبات کا جب ان کانووکیشن ایڈریسز سے موازنہ کرتا ہوں جو ملک کے چیدہ چیدہ نامور ہستیوں نے، جن کے نام کے ساتھ بڑے بڑے سائن بورڈ چسپاں دئے ہیں، تو یقین فرمائیے، میری طبیعت متلانے لگتی ہے۔

ایک طرف آپ کا قرآن کریم سے روشنی لے کر انسان کی فلاح کی خاطر اسلام کو روشناس کرانے کے لیے دعوت عام دینا اور چھوٹے چھوٹے ٹریکٹوں سلامتی کا راستہ، دین حق، اسلام کا سیاسی نظریہ، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر وغیرہ لٹریچر کی اشاعت سے ذہنی انقلاب پیدا کرنا میرے سامنے ہے اور دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ میری قوم کے لیڈر راستی سے بھٹک کر ادنی مقاصد (Minor Ends) پر اپنی اور ساری قوم کی قوت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک طرف آپ کا خطبات جمعہ تحریر کر کے ایک ایک مسجد میں اپنے نصب العین کو عوام تک پہنچانے کی سبیل پیدا کرنا ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے گوسوامی گنیش دت اور پنڈت مدن موہن مالوی بنارس ہندو یونیورسٹی میں مندر کی تعمیر کے لیے لاکھوں روپیہ اکٹھا کرنے کی فکر میں گھلے جا رہے ہیں۔ آریہ سماج کے بارے میں تو میرا یہ عقیدہ ہے کہ اگر آج رشی دیانند کا ظہور ہو تو وہ سب سے پہلے آریہ سماج کا سدھار کریں۔ کانگریس کے ہندو رہنماؤں کے بارے میں ایک مرتبہ لاہور کے عام جلسہ میں چوہدری خلیق الزماں سابق صدر یو۔ پی مسلم لیگ نے فرمایا تھا کہ ہندوؤں کے بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ ٹھیک یہی بات بھائی پرمانند جی فرماتے ہیں کہ ہندوؤں کی بدقسمتی سے شروع سے ہی کانگریس کی ایسے ہندو لیڈروں کے ہاتھوں میں سیاست کی باگ ڈور رہی ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے سیاست کے میدان میں طفل مکتب ہیں۔ جب میں ان حالات پر غور کرتا ہوں تو شاعر کے یہ الفاظ ایک آہ سرد بن کر بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں:۔

"یاسیت کی گردن میں لپٹا ہوا

راستہ تاریک، ویراں اور اداس

زندگی بے کیف و رنگ و نور ہے! کارواں منزل سے کوسوں دور ہے!"

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے، میں بلا مبالغہ عرض کروں گا کہ آپ کے پروگرام نے ملک کی دیگر تمام تحریکوں پر سایہ (Shade) ڈال لیا ہے۔ آپ کا سارا لٹریچر دیکھ جانے کے بعد مجھے بجز ایک کے اور کوئی بھی مسئلہ ایسا نظر نہیں آیا جس میں دیانت داری کے ساتھ آپ سے اختلاف کر سکوں۔ مانتا ہوں کہ آپ کا پروگرام ہر پہلو سے مکمل (ComPlete) اور خود کفایت (Self Sufficient) ہے۔ صرف دو باتیں جو مجھے کھٹکتی ہیں، جناب کی خدمت میں عرض کیا پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

آپ کی تصنیف الجہاد فی الاسلام کے مطالعہ کے بعد میرا یقین تھا کہ سنسکرت زبان پر آپ کا عبور ایک لازمی چیز ہے۔ مگر اُس شام سیر کے وقت دوران گفتگو میں آپ کا یہ فرمانا کہ آپ نے سب کچھ ویدوں کے بارے میں انگریزی کتابوں سے لیا ہے، سچ سچ مجھے یہ جملہ سن کر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی شخص برقی رو کے چھو جانے سے جھٹکا محسوس کرتا ہے جیسے آپ نے فرمایا تھا کہ ایچ، جی، ویلز کا اسلام کے بارے میں براہ راست کیا علم ہے جو انھوں نے اسلام اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پاکیزہ زندگی پر بے معنی نکتہ چینی کر کے رکھ دی، بعینہٖ آپ کا سنسکرت زبان سے براہ راست تعلق نہ ہونے کی وجہ سے وید بھگوان کے بارہ میں آپ کے احساسات مستند نہیں کیے جا سکتے۔ آپ تسلیم کریں گے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں آزادانہ ترجمہ کرنے پر بھی اصل منشا پورا نہیں ہوتا، چہ جائے کہ اسے پھر تیسری زبان میں پیش کیا جائے۔ رشی دیانند نے تو مہی دھر اور ساین آچاریہ کے وید بھاشیہ کو بھی لغو ٹھیرا دیا ہے، پھر کہاں آپ "میکس مُلر" اور دیگر یورپین اصحاب کے ترجمے سے رائے قائم کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی ان نیک اور بلند خواہشات کا جو آپ ہندوؤں کے دل و دماغ سے تعصب دور کر کے انھیں اسلام سے صحیح طور پر روشناس کرانے کے لیے اپنے دل میں رکھتے ہیں، احترام کرتے ہوئے میں مودبانہ یہ گزارش کروں گا کہ آپ آئندہ اپنی ان کتابوں پر نظر ثانی فرماتے وقت، جن میں خاص طور پر ہندو لٹریچر کے حوالے (Refere ncts) پائے جاتے ہیں، کسی ایسے شخص کی امداد حاصل کریں جو ہندو ابھیاس اور ہندو لٹریچر پر براہ راست عبور رکھتا ہو۔ (مجھے ذاتی طور پر ایسے ایک دو اصحاب سے قربت کا فخر حاصل ہے) امید ہے کہ آپ کی ذات مبارک پر میرا منشا واضح ہو گیا ہوگا۔

آپ نے رسالہ "اسلام اور جاہلیت" کے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ "تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریے پر تیار کیے گئے تھے نہ ان سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے، نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لیے رحمت ثابت ہوا۔" اگر صاف گوئی پر معاف فرمایا جائے تو میں نہایت ادب و انکسار سے گزارش کروں گا کہ آپ نے یہاں طرف داری سے کام لیا ہے، یہاں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔ میں صرف ایک بھگوان کرشن کی شخصیت پیش کروں گا جن کی دو حرفی تقریر نے کر

"فعل سے وابستگی واجب نہیں تیرے لیے فرض کی تکمیل کر، خواہش صلہ کی چھوڑ دے"

ویرارجن جیسے مجاہد پر ایک ہیبت کا عالم طاری کر دیا۔ اور اس کے بازو میں برقی طاقت پیدا کر دی۔ اور اس تاریخی واقعہ کی یاد گار میں گیتا جیسی ممتاز کتاب ظہور میں آئی۔ بڑے بڑے مخالف بھی کرشن بھگوان کی زندگی میں کوئی اخلاقی رخنہ نہ پیش کر سکے۔ "بھگوان" کا لفظ میں نے صفتی معنوں میں لیا ہے، اوتار کے معنوں میں نہیں۔ آپ نے ایسی شخصیتوں کو نظر انداز کر کے اسلام سے پہلے کی تاریخ کے معاملہ میں تعصب کا ثبوت دیا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میری آنکھیں ترستی رہیں کہ آپ کسی جگہ کسی ہندو کیرکٹر کا نمونہ پیش کریں، مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

آپ نے ترجمان القرآن میں میرے خطوط اور اپنے جوابات شائع فرما کر اسلامی پریس کے لیے دلچسپی کا سامان مہیا کر دیا۔ دہلی کا ایک روزنامہ "حکومت الٰہیہ اور پاکستان" کے عنوان سے ان خطوط کا حوالہ دے کر آپ پر خوب برسا ہے۔ عجیب منطق ہے کہ دیدہ دانستہ عین اسلامی تعلیم کو جھٹلایا جا رہا ہے!!

مرحوم مولانا محمد علی صاحب نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "جہاں تک مسلمانوں کے ایمان کا تعلق ہے۔ میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں"۔ لیکن آپ نے اصل اسلام پیش کر کے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کو الم نشرح کر کے نہ صرف مسلمانوں کی، بلکہ تمام انسانیت کی زبردست خدمت انجام دی ہے۔ آپ کے اسلامی لٹریچر کے طفیل وہ محسوس کر رہے ہیں کہ انھیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا ہو گئے ہیں۔ مگر میری گذارش یہ ہے کہ جب آپ کی حکومت الٰہیہ ہر فرد و بشر کے لیے انسانیت کے ناطے یکساں جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کا منشا بھی یہی ہے کہ بلا لحاظ مذہب و ملت اسے عوام تک پہنچایا جائے پھر آپ اپنی ساعی (Struggle) کو صرف مسلمانوں تک کیوں محدود رکھتے ہیں"۔

جواب: - آپ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ میں نے سنسکرت زبان اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے براہ راست واقفیت کے بغیر محض یورپین ترجموں کے اعتماد پر اپنی کتاب میں ویدوں سے کیوں بحث کی، لیکن آپ نے اس بات کا خیال نہیں کیا کہ الجہاد فی الاسلام بالکل میرے ابتدائی عہد کی تصنیف ہے جب مذاہب کے معاملہ میں میرا رویہ پوری طرح پختہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہ احتیاط طبیعت میں پیدا ہوئی تھی جو تحقیق کے لیے ضروری ہے۔ اب اگر میں اس کتاب کو دوبارہ لکھوں گا تو ہر اس چیز کی جس کی براہ راست واقفیت کا موقع مجھے نہیں ملا ہے، از سر نو تحقیق کروں گا۔ آپ اگر اس تحقیق میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں گا۔ کوئی ہندو عالم جو خود بھی محض حامی دین (Defender of the faita) نہ ہو، بلکہ خود محقق بھی ہو اور محققانہ انصاف بھی اپنے اندر رکھتا ہو، اگر میری کتاب کے اس حصے پر جو ہندوؤں سے متعلق ہے، تنقید کر کے مجھے بتائے کہ میں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے تو اس سے مجھے بہت مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ اگر آپ مجھے کوئی ایسی کتاب بتائیں جس میں ہندو مذہب کے مقصد جنگ اور قوانین جنگ کو بناوٹ کے بغیر، جیسے کہ بجائے خود وہ ہیں، پیش کیا گیا ہو تو مزید باعث شکر گذاری ہوگا۔ "بناوٹ کے بغیر" کی شرط میں اس لیے لگا رہا ہوں کہ آج کل عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مذہب پر، جیسا کہ وہ بجائے خود ہے، ایمان نہیں رکھتے، مگر قومی عصبیت کی خاطر اس مذہب کو اور اپنے مذہبی طرز عمل ( ) کو "معقول" ( ) بنانے کے لیے وہ اکثر بوجوہ نظریات کے مطابق ایک نیا مذہب گھڑتے ہیں اور پرانے مذہب کے نام سے اسے پیش کرتے ہیں۔ مجھے اس طریقہ سے سخت نفرت ہے خواہ اسے مسلمان برتیں یا ہندو یا کوئی اور۔ میرا خود بھی یہ طریقہ ہے اور میں پسند بھی صرف ایسے ہی لوگوں کو کرتا ہوں جو اصل مذہب کو،

جیسا کہ فی الواقع وہ ہے، ویسا ہی رہنے دیں اور ویسا ہی اسے پیش کریں، پھر اگر وہ ماننے کے لائق ہو تو اسے مانیں اور ماننے کے لائق نہ ہو تو اسے رد کر دیں۔

دوسری چیز جس کی آپ نے شکایت کی ہے، اس پر آپ کو بجائے مجھ سے شکایت کرنے کے خود ہندوؤں سے شکایت کرنی چاہیے تھی اور مجھے بھی اس معاملہ میں ان سے شکایت ہے۔ انھوں نے خود اپنے بزرگوں کی سیرتوں کو محفوظ نہ رکھا بلکہ ان کی حقیقی زندگیوں کو افسانوں سے خلط ملط کر دیا۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح انھوں نے بھی اپنی اخلاقی کمزوریوں کو درست ثابت کرنے کے لیے بدترین اخلاقی کمزوریاں اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کر دیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے جن بڑے بڑے اشخاص کی طرف نگاہیں اس توقع سے اٹھتی ہیں کہ انھیں اخلاقی پاکیزگی اور عظمتِ انسانیت کے نمونہ کی حیثیت سے لیا جا سکے گا، ان کے واقعاتِ زندگی تاریخی حیثیت سے مشتبہ بھی ہیں اور افسانویت سے آلودہ بھی، اور جن ماخذ کی سند سے ان کے روشن پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں انھیں کی سند سے ایسے تاریک ترین پہلو بھی آتے ہیں جنھیں کسی بڑے انسان کی طرف منسوب کرنا تو درکنار کسی گھٹیا انسان کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے، نہ کہ کسی قومی یا مذہبی تعصب کی وجہ سے میں مجبور ہوں کہ تاریخ کے صرف ایک ہی دور کو کمالِ انسانیت کے نمونہ کی حیثیت سے پیش کروں۔ کیونکہ وہ تاریخی حیثیت سے نہایت معتبر بھی ہے، افسانویت کا اضافہ کرنے کی اگر اس میں کوشش کی بھی گئی ہے تو تاریخی تنقید کے ایسے ذرائع موجود ہیں جن سے اس آلودگی کو پورے منصفانہ طریقے سے چھانٹ کر الگ کیا جا سکتا ہے، اور پھر وہاں کسی اخلاقی گندگی کا تو سرے سے نام و نشان ہی نہیں ملتا۔ یہ تو خدا کی دین ہے جس کے نصیب میں آجائے۔ اگر عرب نسل کے ایک مختصر گروہ کو یہ فضل نصیب ہو گیا تو اس پر کسی افسوس کی ضرورت نہیں اور نہ افسوس کرنے سے کچھ حاصل ہے۔ بلکہ اگر آپ ہندوستانی یا ہندو کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے انسانی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانیت کے لیے جو چیز قابلِ فخر ہے، اس پر آپ کو بھی اسی طرح فخر کرنا چاہیے جس طرح ایک عرب فخر کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسانیت کے نقطۂ نظر سے جو تاج کسی انسان یا کسی انسانی گروہ کو پہنایا گیا، وہ ہم سب انسانوں کے لیے تاجِ فخر ہی ہے، خواہ وہ کسی عرب انسان کے سر پر نظر آئے یا ہندوستانی انسان کے سر پر!!

النظر فی الحدیث کا ضرور مطالعہ کیجیے

اردو زبان میں اصولِ حدیث کے فن کی یہ نہایت ہی نادر الوجود اور بے نظیر کتاب ہے۔ اس میں قدماء اور متاخرین محدثین محققین کی بے شمار عربی کتابوں سے ان تمام اصولِ روایت اور اصولِ درایت کو مولانا ابو سعید صاحب جھکاوی نے نہایت عمدہ ترتیب اور تفصیل سے ایک جگہ جمع کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے صحیح حدیثوں سے غیر صحیح میں آسانی کے ساتھ تمیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کا بھی صاف انکشاف ہو جاتا ہے کہ علوم فلسفہ اور سائنس سے کون حدیثیں موافق اور کون مخالف ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مختلف فرقے اپنے مسائل کا کن کتب حدیث اور کس قسم کی حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ قیمت ۱۲ علاوہ محصول ڈاک۔ پتہ:- انجمن حزب الاسلام، مقام و ڈاکخانہ مصطفیٰ آباد ضلع سارن۔